ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

# اردو غزل کا تہذیبی منظر نامہ

# (معروف شعرا کے خصوصی مطالعہ کے ساتھ)

## *THE CULTURAL LANDSCAPE OF URDU GHAZAL*

***Uzma Noreen***
*Lecturer G.C Women University Sialkot*
***Dr. Nazia Younis***
*Assistant Professor Urdu Department, National University of Modern Languages Islamabad*

***Abstract***
*Urdu Ghazal presents a subtle and complex form of love, in which human relationships, relationships with God, and the ephemeral nature of the world are described. Its cultural foundations are connected to the common culture of India and the traditions of Muslims, where Persian, Arabic, and Hindi influences have combined to give Urdu Ghazal a special artistic and cultural color.*
*The art of composing Ghazal is very ancient in poetry, with its origins in 7th century Arabic poetry. Its spread in the Indian subcontinent in the 12th century due to the influence of saints and Sufis and the famous courts and gatherings of the dominant Islamic empire, and now this important type of poetry has some form in the local languages of South Asia and the Turkish language. Usually, a Ghazal consisted of five to fifteen lines, which did not need each other, but in an abstract way they added depth to the Ghazal and its meaning. Each line of the Ghazal is connected to a single theme and a single development. Their development is quite similar to the Petrarchan sonnet. Due to its captivating nature in terms of style and content, the Ghazal tradition remains effective in expressing its central themes of love and separation. Various researchers and poets have given their opinions regarding the definition and meaning of Ghazal.*
***Key Words:*** *Urdu Ghazal, culture of India, special artistic, saints and Sufis, Asia, Turkish.*

ادو غزل ہندو مسلم تہذیب کا مشترکہ بیانیہ ہے جس میں ان دونوں اقوام نے اپنا برابر حصہ ڈالا۔ عموماً تہذیب کے اہم عناصر شمار کیے جاتے ہیں۔

۱۔ مذہب / عقیدہ / نظریہ

۲۔ جغرافیہ / ماحول (آب وہوا، نسل، ملک، سیاست اور پنداواری نظام):

۳۔ تاریخی روایت / حافظہ / زماہ

غرض تہذیب انھی عناصر سے بنتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان عناصر کے ملاپ سے تہذیب کا ارتقا ہوتا ہے۔

جب برصغیر میں مسلمانوں کی آمد ہوئی تو وہ انھیں ترک ایرانی پس منظر کے ساتھ آئے۔ دوسرا یہ کہ یہاں کے صرف تیس فی صد تک عوام نے اسلام قبول کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں دو بڑی اقوام ہندو اور مسلمان رہے۔ مسلمانوں نے یہاں آنے کے بعد زیادہ عرصہ تک حکومت کی۔ اس وجہ سے ان کے اثرات ہندوؤں کے سارتھ دیگر مذاہب کے ماننے والوں پر بھی پڑے۔ اسی طرح دونوں طرف سے ایک دوسرے کو قبول کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ کشش اور کھنچاؤ کے اس عمل نے ہند مسلم تہذیب کی داغ بیل ڈالی۔ بہر حال یہ تو تہذیب کی بحث تھی۔ یہاں ہم اردو غزل کے تہذیبی مطالعے کا ذکر کریں گے۔ اردو کے اولین شعرا میں شامل امیر خسرو وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے نہ صرف فارسی بلکہ ہندی اور علاقائی زبانوں میں شاعری کی۔ یہاں اُن کا وہ شعر نقل کیا جارہا ہے

جس کا پہلا مصرعہ اردو دوسرا ہندی میں ہے:

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہیو کا ہے لگائے چھتیاں (۱)

قدیم ایرانی علامات ہندوستانی شعر و سخن پر بھی اپنے اثرات ڈالے۔ رستم و سہراب، جمشید، نوشیروان، اہرمن، یزدان سب ایرانی تہذیب کا دین ہیں۔ عربی و عجم کی اصطلاح میں عرب کو بولنے والا اور عجم یعنی ایرانیوں کو گونگا شمار کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی مسلمان یکتائی اور وحدت کا حامی رہے جب کہ ایرانی چوں کہ عربوں کے حریف رہے اس لیے انھوں نے یکتائی اور وحدت کی بجائے تنویت اور وحدت کی جگہ کثرت اپنائی۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیبی سطح پر وابستگی اور وارستگی کی یہ خصوصیات اردو غزل کا حصہ بنیں۔ غزل کی ہیئت بھی عربی قصیدے کی ہے۔ البتہ ایرانیوں نے قصیدے سے تشبیب کو الگ کیا تو غزل کے خدوخال نظر آئے اور پھر یہ غزل اردو شاعری میں ایسی رچ بس گئی کہ دیگر اصناف کو منہ کی کھانی پڑی۔ یوں یہ اردو شاعری کی آبرو بن گئی۔ جیسے رشید احمد صدیقی کا قول ہے:

"میں اردو غزل کو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں۔ البتہ ہمارے ہاں غزل میں بے راہ روی ملتی۔ جی بھر کے بے راہ روی۔"(۲)

اس طرح غزل میں بات دو مصرعوں میں مکمل ہوتی ہے۔ اس لیے اس میں علامت اور کنایہ لازمی قرار دیے گئے۔ ساتھ ساتھ اس علامات کو عربی کے الٹ معنی رائج ہو گئے۔ اس حوالے سے ایک اقتباس دیکھیں:

"غزل کی روایت یہ ہے کہ اس میں مکر و ریا اور فریب جیسی تمام چیزوں سے شدید نفرت نظر آتی ہے۔ نفاق سے نفرت نظر آتی ہے۔ اب یہ دیکھ کر ہماری غزلوں کے اندر زاہد اور واعظ کا کیا مقام ہے۔ یہ سب کے سب اس فریب، ریاکاری، ظاہر داری اور دھوم دھڑکے کی علامت ہیں جس سے نفرت کا اظہار کیا جا رہا ہے۔"(۳)

اس طرح اردو غزل میں لفظ "بت" اور "کافر" دونوں الفاظ کو منفرد حیثیت میں لیا گیا۔ اسی طرح ایک اور لفظ "رقیب" جو کہ عربی سے لیا گیا ہے۔ اگرچہ عربی میں اس کے معنی نگہبان کے ہیں مگر اردو میں ایک خاص شخص کی علامت ہے اور بہت ہی مشہور ہے۔ غزل میں علامت کا ذخیرہ بھی فارسی کے مشہور شعرا رودکیؔ، مسعود سعد سلیمانؔ، سعدیؔ، حافظؔ، فردوسیؔ اور فرخیؔ وغیرہ سے لیا گیا۔ بعد میں میر تقی میرؔ اور دردؔ کے ہاں تصوف نے بھی اردو غزل میں جگہ پائی۔ اگرچہ بہت سے شعرا تصوف کو ناپسند کرتے تھے، جیسے کہ میرؔ۔ اس کے باوجود ان سے تصوف مضامین سرزد ہوتے رہتے تھے۔ جیسے:

آگے عالم عین تھا اس کا، اب عین عالم ہے وہ
اس وحدت سے یہ کثرت ہے یاں، میرا سب گیان گیا

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں
اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں

جگ میں آ کر ادھر اُدھر دیکھا
تو ہی نظر آیا جدھر دیکھا

آگے کس کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے (۴)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تصوف صرف فلسفہ نہیں بلکہ زندگی گزارنے کا رویہ ہے۔ البتہ میرؔ کے ہاں تصوف کے مضامین کا انداز جداگانہ ہے۔ مثلاً ایک جگہ وہ مجنوں کو صحرائی کہہ کر رد کر دیتے ہیں اور خود کو شہری کہہ کر خود کو افضل قرار دیا ہے:

ہم تو شعری عاشق ہیں کیا نسبت ان دونوں سے
ہے فرہاد ایک آدم کو ہی مجنوں اک صحرائی سے (۵)

ایک اور جگہ ایسے لکھتے ہیں کہ تصوف کا گمان بھی نہیں ہوتا:

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا (۶)

اس کے بعد غزل میں ایہام گوئی نے جڑ پکڑ لی۔ یعنی معیار فارسی ہی تھا۔ اس طرح غزل میں فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی اور بھاشا زبانوں کو بھی شامل کیا گیا۔ علم وبیان وبدیع کے زیرِ اثر شعرا کے ہاں ذومعنی الفاظ کے استعمال نے ایہام گوئی کو فروغ دیا۔ یوں بقول جمیل جالبی اور شمیم کاشمیری تہذیب کا ایک نیا زاویہ فروغ پایا جس میں شمالی ہند خصوصاً دہلی کی تہذیب میں زو معنویت پنپنے لگی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں زیادہ تر ایسے شعرا نے کلام لکھا جو فارسی کے ساتھ مساوی اپنی صلاحیتوں کو نکھار دے رہے تھے۔ یوں فارسی تراکیب نے اردو میں جگہ پائی اور اس طرح اردو غزل کا عہدِ زریں شروع ہوا کس میں میر وسودا سمیت کئی اہم غزل گو سامنے آئے۔ اس حوالے سے میر تقی میر کے ہاں دیکھیں ایک نیا اندازِ دلربائی:

ہے غزل میر یہ شفائی کی
ہم نے بھی طبع آزمائی کی

اس پردے میں غم دل کہتا تھا میرا اپنا
کیا شعر و شاعری ہے یارو شعار عاشق

شعر کے پردے میں غم سنایا ہے بہت
مرثیے نے دل کے میرے بھی رلایا ہے بہت (۷)

اوپر کے اشعار میں ایک طرح کی تہہ داری نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی پودے کی بھی بات کرتے ہیں اور یہی تہہ داری تصوف کے ساتھ جاملتی ہے۔ مثلاً کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

میر صاحب کا ہر سخن ہے رمز
بے حقیقت ہے شیخ کیا جانے

زلف سا پیچ دار ہے ہر شعر
ہے سخن میرؔ کا عجب ڈھب کا

سہل ہے میرؔ کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

کوئی ہم سا بھی اپنی جان کا دشمن کہیں ہو گا
بھری مجلس میں بیٹھے عشق کا اقرار کرتے ہیں (۸)

اس طرح شاعری میں جھاڑ و جھنکار سے اردو غزل کو صاف کرنا بھی میر کا کمال ہے کہ یہ صاف و شفاف ہو گئی۔ وہ کہتے ہیں:

میں نے کیا اس غزل کو سہل کیا
قافیے ہی تھے اس کے اوٹ پٹانگ

میرؔ شاعر بھی زور تھا کوئی
دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب

گر دیکھو گے تم طرزِ کلام اس کی نظر کر
اے اہلِ سخن میر کو استاد کرو گے

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے
ہماری گفتگو کا ڈھب جدا ہے

اور آخر میں یوں کہتے ہیں:

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے (۹)

میر ہندو مسلم تہذیب کے حوالے سے ایک بہت بڑے نمائندے کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

بت پرستی تو اسلام نہیں کہتے ہیں
معتقد کون ہے میر ایسی مسلمانی کا

بت کیا چیز ہے جو کو خدا مانتے ہیں سب
خوش اعتقاد کتنے ہیں ہندوستان کے لوگ

صورت پرست ہوئی معنی آشنا
ہے عشق بتوں کے مرا مدعا کچھ اور

اور یہ آخری شعر

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق کا اختیار کیا (۱۰)

اوپر کے اشعار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میرؔ بتوں کی حمایت کرتے ہیں مگر اسلام کا دامن نہیں چھوڑتے۔ الغرض میرؔ کے حوالے سے کافی بحث کی جاسکتی ہے لیکن آگے بڑھتے ہوئے سوداؔ کی غزل کا تہذیبی رنگ دیکھتے ہیں۔

سوداؔ نے اردو غزل میں فارسی کا سا انداز اختیار کیا۔ ان کے ہاں بلند آہنگی ہے جھنکارہے۔ جذبہ معنی کے اظہار کی پرتیں ہیں۔ ایک مثال یہ ہے:

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں (۱۱)

اس طرح سودا میر کے خلاف اپنے کلام کو نیشا پور لے کے جانے کے خواہش مند ہیں۔ سوداؔ کی غزل میں انسان دوستی ہے۔ وہ وحدت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح سوداؔ کے ہاں تصوف کے مضامین بھی ملتے ہیں لیکن ان کے تصوف میں انسان دوستی یعنی حقوق العباد کا درس زیادہ ملتا ہے۔ وہ عشق بتاں کے پرستار ہیں۔ ساتھ ساتھ معاملہ بندی ہے۔ وہ تعصب کے خلاف ہیں۔ اختلافات کی بجائے وسیع المشربی کا درس دیتے ہیں۔ چند مثالیں یہ ہیں:

پردے کو تعین کے درِ دل سے اٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

کہاں ہے شیخ جو دیکھے میرے بت کے کرشمے کو
کہ ہر بندہ خدا کا کر لیا جس نے غلام اپنا

ہے حسن سے یہ فیض کہ صحبت میں بتاں کے
بدخلقی جسے کہتے ہیں سو ناز کہا یا

گالی دی مجھے ان نے، دعا غیر نے اس کو
محرم نہیں ناداں وہ اس اشتاق نہاں کا

عشق کی بھی منزلت کچھ کم خدائی سے نہیں
ایک سا احوال یاں بھی ہے گدا و شاہ کا (۱۲)

خواجہ میر درد کا تعلق سلسلہ نقشبندیہ سے تھا۔ انھوں نے طریقت کی محفلیں سجائیں۔ انھوں نے "علم الکتاب" جیسی کتاب لکھی۔ جو تصوف و طریقت کا مظہر ہے۔ قرآن مجید اور احادیث کے حوالے میں وہ ایک باعمل صوفی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی کو کبھی نہیں چھوڑا نہ بادشاہ کے پاس گئے۔ وہ تصوف کے شاعر تھے اس لیے ان کے سامنے تہذیب کی بنیادیں میر و سودا سے الگ تھیں۔ وہ بھی سودا کی طرح نفرت کے قائل نہیں۔ وہ احترام انسانیت کے قائل ہیں۔ وہ ناصحانہ انداز میں تصوف کے مزاج بناتے ہیں۔ محبت اور یگانگت ان کے ہاں عام ہیں۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

مختلف حوالوں سے تہذیبی مثالیں یہ ہیں:

مدرسہ یا دیر تھا، کعبہ یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے، واں تو ہی صاحب خانہ تھا

تعین گر مٹے دل سے تو کفر آثار ہو جائے
اگر عقدے کھلیں تسبیح کے، زنار ہو جائے

درد دل کے واسطے پیدا کیا انساں کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

دونوں جہاں کب تیری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے (۱۳)

جب ہم غالب کی بات کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ہاں رقیب کی کئی حیثیتیں ہیں جو اس سے پہلے کسی نے نہیں گنوائیں۔ مثلاً وہ رازدار، نامہ نزار غم خوار ہے۔ ساتھ ساتھ اس سے خوف بھی آتا ہے۔ اس پر رشک بھی آتا ہے۔ ان کے ہاں عشق میں زخم سوزن بھی ہے۔ وہ سوچ و فکر کے اُس آسماں پر ہے جہاں کسی کا ذہن کب پہنچ سکتا ہے۔ محبوب کے ساتھ شرارتیں بھی کرتا ہے۔ طنز و مزاح بھی۔ یہ مثالیں دیکھیں:

ہم رقیب سے نہیں کرتے وداع ہوئیں
مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیار بے حیف

تمنا ہے اسد، قتل رقیب اور شکر کا سجدہ
دعائے دل یہ محراب خم شمشیر بہتر ہے

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آشیاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، غیر ہمیں اٹھائے کیوں

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و رہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر، تھا جو راز داں اپنا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کے رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا (۱۴)

وہ زبان کے تہذیبی رچاؤ سے اپنے کلام کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"میں نے اردو کو دہلی سے اصفہان پہنچا دیا ہے اور فارسی کو شیراز سے ہندوستان لے آیا ہوں۔"(۱۵)

غالب کے تصوف کے حوالے سے وحدت الوجود کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔اگرچہ وہ مذہبی معاملات سے بے گانہ رہے لیکن اسمِ حق کا ورد کرنے سے صنم کا دیدار نصیب ہو جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر و بیشتر اپنے کلام میں طنزیہ انداز اختیار کر جاتے ہیں:

بت پرستی ہے بہار نقش بندی ہائے دہر
ہر صریر خامہ میں ایک نالہ ناقوس تھا

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریر خامہ نوائے سروش ہے

آخر کار گرفتار سرِ زلف ہوا
وہ دل دیوانہ کہ وارستہ مذہب تھا

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

جانتا ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے (۱۶)

الغرض اردو غزل نے تہذیبی حوالوں سے ان مشہور شعرا کے ہاں اپنی ایسی جولانیاں دکھائی ہیں کہ اردو شاعری کا دامن موتیوں سے بھر دیا ہے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

## حوالہ جات

۱۔ سید طارق حسین زیدی، اردو غزل میں ہندو مسلم تہذیب کی عکاسی (غیر مطبوعہ مقالہ)، جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۵، ص ۱۹
۲۔ رشید احمد صدیقی، خطبات رشید احمد صدیقی، مکتبہ دنیال، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۳۶۵
۳۔
۴۔ سید طارق حسین زیدی، اردو غزل میں ہندو مسلم تہذیب کی عکاسی، ص ۳۵۔۳۶
۵۔ ایضاً، ص ۳۷
۶۔ ایضاً
۷۔ ایضاً، ص ۴۵۔۴۶
۸۔ ایضاً، ص ۱۸۔۴۷
۹۔ ایضاً، ص ۵۲۔۵۴۔۵۵
۱۰۔ ایضاً، ص ۶۰۔۶۱
۱۱۔ ایضاً، ص ۶۹
۱۲۔ ایضاً، ص ۶۸، ۶۶۔۷۵
۱۳۔ ایضاً، ص ۸۴۔۸۷۔۹۰
۱۴۔ ایضاً، ص ۱۸۶۔۱۹۲، ۱۹۰۔۱۹۶
۱۵۔ اسد اللہ خان غالب، دیباچہ، گل رعنا، مشمولہ
۱۶۔ ایضاً، ص ۱۹۸۔۱۹۹، ۲۰۰۔۲۰۳